معیار: علمی و تحقیقی مجلّہ، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد: ۱، شمارہ: ۱، جنوری- جون ۲۰۰۹ء

جدیدیت، وجودیت اور اُردو ناول

حمیرا اشفاق*

جدیدیت سے مراد وہ فکری روّیے ہیں جو قدیم سے انحراف کا نتیجہ سمجھے جاتے ہیں۔ جدیدیت کی یہ تعریف اس کا صرف ایک پہلو تو ہو سکتی ہے لیکن اس کی فلسفیانہ و فکری اساس کو نہیں چھو سکتی۔ شمیم حنفی جدیدیت کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''تجدّد پرستی کا اوّل و آخر اپنے زمانی رشتوں کا پابند ہے اور اس اعتبار سے ہر وہ روّیہ جو زندگی کی پرانی قدروں سے گریز اور نئی قدروں کی جستجو کا پتہ دیتا ہے، جدید ہے۔ دوسرے الفاظ میں تجدد پرستی معاصریت کی ہم معنی ہوئی اور گزرے ہوئے کل کی ''ہر وہ حقیقت جسے ''آج کی'' ذہنی تائید حاصل نہ ہو سکے۔ قدیم کی مترادف ہوئی''۔ [۱]

جدیدیت کا دائرہ عمل سائنس اور مذہب تک پھیلا ہوا ہے، اس کی اوّلین مثال احیاء العلوم کی تحریک میں ملتی ہے، جس میں انسان اور کائنات کو خارجی فارمولوں کے ذریعے نئے معانی اور مفاہیم سے سمجھنے کی کوشش کی گئی، جس کے نتیجے میں ''سائنسی عقلیت پرستی'' کو فروغ ملا۔ مذہبی تقلیدیت (Orthodoxy) میں عقل و منطق کے استعمال سے دو اہم فکری رجحانات پیدا ہوئے جن سے عالمگیر تاریخی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ پہلا رجحان سیکولرازم اور دوسرا انسان دوستی کا، ویسے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں دونوں جڑواں اور لازم و ملزوم روّیے ہیں اور دونوں کی بنیاد مذہبی عقائد میں تشکیک پر ہے۔ سیکولر اور عقلی روّیے کے نتیجے میں جب مذہبی اعتقادات متزلزل ہونے لگے تو ایک نفسیاتی کشمکش کا پیدا ہونا لازم تھا اسی کشمکش سے نبرد آزما ہونے کی فکری کوشش اور جذباتی اخلاص کا نتیجہ ہیومنزم (Humanism) تھا'' [۲]

ہیومنزم کو روشن خیالی کی تحریک بھی کہا گیا، اس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا عقل کے ذریعے تمام مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے اور دنیا کو تباہ کرنے والے عناصر مثلاً جبر اور جہالت کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ فلسفہ مہابیانیہ کی شکل اختیار کر گیا۔ یہی مہابیانیہ جدیدیت کی اساس ہے۔ یوں جدیدیت نے بھی دنیا کے تمام مسائل کو حل کرنے کا بیڑا اٹھایا گو یہ سب ایک بہترین تخیّل ہو سکتا تھا لیکن پورے عالم کو اپنے تصور کے مطابق بدلنا ممکن ہی نہ تھا، اس لیے یہ سب کچھ تصوراتی ثابت ہوا۔

یوں انسانی زندگی اور ادب کے مقاصد کو دوبارہ متعیّن کیا گیا نہ صرف ادب بلکہ تمام فنونِ لطیفہ اس تبدیلی کے مظہر بن گئے۔ جدیدیت نے تین بنیادی باتوں پر اصرار کیا جن میں عقل پرستی کو فروغ ملا، اسی طرح انسان کے داخل کو اہم جانا۔ مزید یہ کہ انسانی سوچ اور فکر کی آزادی پر زور دیا۔ انہی عناصر کی ایک جھلک ہمیں نطشے کے سپرمین کے تصوّر میں بھی نظر آتی ہے گویا اس تصوّر سے جدید دور کے فرد کو

* استاد، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

سمجھنے کا فلسفہ بھی موجود ہے لیکن ناصر عباس نیّر سپر مین کے تصوّر اور جدید فرد کے تصوّر کی مزید وضاحت اور دونوں میں فرق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سپر مین دراصل کسی نظریے، مقصد اور ماورائی نصب العین کی غلامی پسند نہیں کرتا، آزاد، خود مختار اور شدید انفرادیت پسند تھا، وجودیت کے فلسفے میں اسی تصوّرِ فرد اور اس کے منطقی مضمرات کو اہمیت ملی، (وجودیت، جدیدیت کا اہم جزو ہے) تاہم جدید ادب نے جس فرد کی بالعموم ترجمانی کی ہے وہ سپر مین کا ہو بہو عکس بہر حال نہیں ہے۔ جدید ادب کا فرد زندگی کی کلفتوں، غلاظتوں، محرومیوں اور نارسائیوں کا ادراک کرتا اور خود کو بے بس پاتا ہے۔۔۔۔۔۔جبکہ سپر مین کے ہاں بے بسی کا کوئی شائبہ نہیں'' ۳؎

جدیدیت میں فرد کے جذبات کی بجائے اس کو خارجی اور سائنسی فارمولوں سے پرکھنے کی کوشش کی گئی اور سائنس کو ہی صداقت کا معیار سمجھا جانے لگا اور عقل کو تمام مسائل کا حل جانا گیا اس طرح وہ ''فرد'' پیدا ہوا جو تنہا اور سماج سے کٹا ہوا تھا، اور خارج سے ہٹ کر اپنے داخل میں گم ہونے والا تھا۔

جدید فرد کی اس داخلی کیفیت کو مریضانہ عمل یا سوچ بھی کہا گیا لیکن سارتر نے اس بات کو رد کر کے جدیدیت کی وضاحت میں کئی دلائل پیش کیے۔ جب جنگوں میں ہزاروں لاکھوں لوگوں کی اموات واقع ہوئیں تو اس میں اجتماع کا نوحہ ملتا ہے لیکن کسی ایک فرد کی نہ تو کوئی پہچان تھی اور نہ ہی کوئی تشخص تھا۔ فرد کو اجتماع میں گم ہو گیا۔ یہاں تک کہ سائنس نے بھی فرد کے لیے کوئی بڑا نظریہ پیش نہیں کیا بلکہ اس نے بھی اجتماع کو ہی مخاطب کیا ہے مثلاً اجتماعی لاشعور کا نظریہ، ڈارون کی تھیوری وغیرہ۔ اس طرح کے نظریات اور خیالات نے انسان کو بے بس اور تنہا کر دیا اس کی خوشیوں کو اجتماع کی خوشی کے ساتھ لازم و ملزوم قرار دیا اور اس کے غم میں وہ بے نام اور اکیلا تھا لیکن اس کی آواز اجتماع میں کہیں گم ہو چکی تھی۔ جدید فرد سماج کو اپنی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ تصوّر کرنے لگا اور پھر اپنی ذات کی تلاش کے سفر پر گامزن ہوا۔ اپنے وجود کے تشخص کے لیے اس نے وجودی فکر کو اپنایا۔

وجودیت میں انسان کو اوّل اور اس کے جوہر کو ثانوی حیثیت دی گئی، جس نے انسان کو بطور ''فرد'' اہمیت کا احساس دلایا اور مخفی صلاحیتوں کے ادراک اور انتخاب کی آزادی کے تصوّر نے انسان کو جینے کا حوصلہ عطا کیا۔ اس طرزِ فکر کی بنیاد پہلی اور دوسری جنگِ عظیم بنی۔ صنعتی انقلاب سے معاشرتی ڈھانچہ شکست و ریخت کا شکار ہو گیا تھا، زرعی معاشرے میں انسان، ایک خاندان ایک کل ایک مرکز کا حصّہ تھا، جب وہ اپنا گاؤں، نسل اور قبیلہ چھوڑ کر شہر آ بسا تو اُسے احساس تنہائی نے آ گھیرا، اُسے احساس ہوا کہ جنگ میں لاکھوں، کروڑوں لوگ ایسے ہی مر گئے ہیں، ان کی کوئی شناخت، مذہب اور حوالہ نہیں ہے تو بھلا انسانی زندگی کا کیا حوالہ ہو سکتا ہے۔ یوں انسان، مذہب اور خدا کے تصوّر سے بھی باغی ہو گیا۔

وجودی فکر میں کچھ ادیبوں کے ہاں لادینیت کا تصوّر پایا جاتا ہے مثلاً سارتر اور کامیو کے ہاں مذہب سے بڑا مقام انسانیت پرستی کا نظر آتا ہے جبکہ کرکیگارڈ کے نزدیک مذہب ہی سب کچھ ہے لیکن ان اختلافات کے ساتھ ساتھ کچھ مشترک نظریات بھی ملتے ہیں جو قریباً سبھی وجودیوں کے ہاں نظر آتے ہیں۔ مثلاً تمام وجودی فکر رکھنے والے عقلیت کی کلّیت سے انکار کرتے ہیں، انفرادیت پر اصرار کرتے ہیں، سائنسی صداقت پر تشکیک کا اظہار کرتے ہیں اور اس بات پر متفق ہیں۔

''وجود جوہر پر مقدم ہے''

انسانی وجود کو تو ہر دور میں تسلیم کیا گیا ہے وجودی فکر محض ''فرد'' کے وجود پر اصرار کرتی ہے۔ وجودی ادب میں ''مایوسی''، ''کرب'' اور ''بے بسی'' کے الفاظ بار بار دہرائے جاتے ہیں، ان الفاظ کے پسِ منظر میں وجودی فلسفے کی اساس موجود ہے۔ مایوسی سے مراد ہے کہ انسان تمام عمر ایک صورت حال سے گزرتا ہے، وہ ایک کا خاتمہ کر بھی لے اور تو ایک نئی صورت حال اس کی منتظر ہوتی ہے گویا انسان تمام عمر اس دیوار کو نہیں چاٹ سکتا۔ اور نہ ہی اس صورت حال سے آزاد ہو سکتا ہے۔

بے کسی سے مراد یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں تنہا ہے یعنی خدا نہیں ہے۔ خدا سے انکار کا مطلب مذہب کی اجارہ داری سے انکار ہے یعنی انسان اپنے فعل کا مرتکب تو خود ہو لیکن اس کی توجیہات مذہب میں تلاش کرے اور خیر و شر میں انتخاب کی ذمہ داری دوسری ذات پر لاد دے اور خود بری الذمہ ہو جائے جبکہ وجودیت کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے جذبات کا خود ذمہ دار ہے اور جذبے کی قدر کا تعیّن عمل ہی سے ہو سکتا ہے۔ گویا وجودیت انسان کو بے چارگی سے نکال کر انسان کو وقار عطا کرتی ہے۔ وجودی فکر میں ہر لمحہ خوشی، غم، جنت یا جہنم کا تعیّن انسان کا عمل کرتا ہے۔ اس فلسفے کو پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے درمیانے وقفے میں حد درجہ مقبولیت حاصل ہوئی، خاص طور پر فرانس اور جرمنی میں اسے حد درجہ قبولِ عام حاصل ہوا۔

اس فکر نے مغرب کے ادب کو متاثر کیا اس کی جھلک اس عہد کی تحریروں میں واضح نظر آتی ہے، سارتر جس کو وجودی فلسفے کا سب سے بڑا علم بردار بھی کہا جاتا ہے، اس نے اپنے نظریات کی ترسیل اپنے ناولوں اور اپنی تحریروں میں بڑے موثر انداز میں کی۔ ۱۹۳۸ء میں اس کا ناول Nausea شائع ہوا، اور ۱۹۴۳ء میں اس کی فلسفے کی کتاب Beings and Nothingness منظرِ عام پر آئی، ان دونوں کتابوں میں وجودی نظریات کی وضاحت بھی ملتی ہے اور وجودی فکر پر اُٹھنے والے اعتراضات کے مدلل جوابات بھی ملتے ہیں اس کے علاوہ سارتر کے اہم ناول

☆ Road to Freedom

☆ The Age of Reason

☆ The Reprieve

☆ Iron in the Soul

بھی ہیں لیکن جس ناول کو سب سے زیادہ اہمیت ملی وہ Nausea ہی ہے اس ناول کا مرکزی کردار کوٹنٹن ایک ادیب ہے جو کائنات کی تمام اشیاء کو لغو تصوّر کرتا ہے، اس لغویت میں معنی کی تلاش میں وہ ناول تحریر کرتا ہے اس کو ہر چیز بے ہیئت، بے مقصد نظر آتی ہے۔ سارتر کے ہاں متلی کا رشتہ براہِ راست اس کے شعور سے ہے جہاں چیزوں کو وہ ہضم (Digest) نہیں کر پاتا اور باہر اگلتا (Vomit) رہتا ہے۔ جس سے ایک طرح کی لغویت پیدا ہوتی ہے جو وجودیت کا ایک اہم عنصر ہے۔ سارتر کی اس فلسفیانہ فکر نے بیسویں صدی کے ادیبوں اور شاعروں کو بہت متاثر کیا۔ البرٹ کامیو نے اس فلسفہ لغویت کو وسعت دینے کی کوشش کی، اس کے نزدیک واحد سنجیدہ مسئلہ خودکشی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان دائمی طور پر بے معنویت کا شکار ہے۔ سسی فس (Sysiphus) کی طرح بے مقصد اور بے سود تگ و دو کا المیہ قبول کر لینا چاہیے۔ یہی فلسفہ ان کے ناول The Outsider میں نظر آتا ہے، اس کا مرکزی کردار ''مرسو'' ایک بے معنی اور لغو آدمی ہے جس کے اندر ماں کے مرنے پر بھی کوئی احساس نہیں جاگتا۔ مرسو ایک قتل کا مرتکب ہو جاتا ہے مگر پھر بھی اسے احساس نہیں ہوتا، یہاں تک کہ پھانسی بھی اس کے اندر کوئی بڑا ہیجان پیدا نہیں کر سکتی وہ موت کو گلے لگا کر زندگی

کی معنویت میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ The Plague کامیو کا ایک ناول ہے اس کا موضوع یہ ہے کہ جب کوئی مصیبت نازل ہو جائے تو اس کا مقابلہ کس طرح اور کیوں کرنا چاہیے، اس کے پسِ منظر میں کامیو کا مدافعت کی تحریک کا تجربہ نظر آتا ہے، جو اسے فرانس پر جرمنوں کے قبضے کے بعد حاصل ہوا تھا۔

کامیو کا نوبل پرائز یافتہ ناول The Fall ہے۔ اس ناول میں کامیو کا یہ نظریہ سامنے آتا ہے کہ انسانی وجود گناہ آلود ہے کیونکہ دریائے سین میں عورت کی خودکشی کے واقعے کو بنیاد بنا کر وہ اس ناول کے مرکزی کردار کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے وجود اور گناہ کی اس آمیزش سے اس ناول کی اثر پذیری میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

وجودی مفکرین میں سیمین دی بووائر، کولن ولسن، اٹالو کولوینو (Italo Calvino) الف ایلسن، ارنسٹ ہمینگوے کے ناول بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں اسی طرح انگریزی ناول نگار David Lindsay اور امریکی ناول نگار Ayan Rand کے ناول بھی وجودی فکر کے عکاس ہیں۔

دنیائے ادب میں جتنی بھی تحریکیں مغرب سے ابھریں ان میں سے بیشتر کا تعلق فرانس سے ہے لیکن فرانسیسی سے انگریزی اور انگریزی سے اردو تک کا یہ سفر کسی نہ کسی حد تک متاثر کن تھا اس طرح کے اثرات کی جھلک ہمیں جدید اردو ادب کے نت نئے بدلتے فکری اور ہیئتی زاویوں میں نظر آتی ہے۔ ان ہی رجحانات میں ایک رجحان وجودیت کا بھی ہے جو اردو ادب پر اثر انداز ہوا لیکن اس کی شکل قدرے بدل گئی کیونکہ یہ صورتِ حال پر زور دیتا ہے اور اس کی تعبیر یا اشتراک کی ایک صورت تصوّف سے ملا کر بھی کی گئی لیکن سارتر کے خدا سے انکار کو ہمارے یہاں تسلیم نہ کیا گیا تاہم ہمارے ادیبوں نے وجودیت کے فلسفے میں دلچسپی لی اور اس پر اپنی رائے بھی ظاہر کی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''اس فلسفے نے بیسویں صدی کے ذہن انسانی کو ناامیدی، بے یقینی، عدم اعتماد اور بحران سے نجات دلا کر اپنی ذات پر اعتماد کرنا سکھایا۔ اس نے خیر و شر کی ساری ذمہ داری فرد کے کاندھوں پر ڈال دی اور بتایا کہ آدمی اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو وہ خود کو بناتا ہے، ذات کے عرفان کا مسئلہ ہم مشرقیوں کے لیے کوئی ایسی نئی چیز نہیں لیکن یورپ میں جہاں سائنس کی ترقی نے فلک افلاک کو چھو لیا تھا۔۔۔۔ عرفانِ ذات کے اس فلسفے نے بحران زدہ انسان میں زندگی کی روح پھونک دی'' [۴]

جب کہ محمد حسن عسکری اس فلسفے کو مغرب کی مذہب پر یلغار قرار دیتے ہوئے اس کی توجیہہ یوں پیش کرتے ہیں۔ ۔۔۔۔ فرد کو ہر لمحے کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا پڑتا ہے اور ہر فیصلے کے ساتھ وہ اپنے جوہر اور اپنی ماہیت کا تعین کرتا ہے لیکن چونکہ ہر لمحے نئی قسم کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے، اس لیے ماہیت کا تعیّن بھی مستقل طور سے نہیں ہو سکتا۔ ہر فیصلے اور ہر لمحے کے ساتھ جوہر اور ماہیت کا تعین بدلتا رہتا ہے۔

اس سارے فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ اپنی ماہیت کا تعین انسان خود کرتا ہے، خدا نہیں

۲۔ اس ماہیت کا تعین عمل کے ذریعے ہوتا ہے

۳۔ یہ ماہیت مستقل چیز نہیں، بلکہ بدلتی رہتی ہے

ظاہر ہے کہ یہ سارے خیالات دین کی نفی کرتے ہیں، لیکن آج کل بہت سے مغربی مفکر عیسوی دینیات کو یہی رنگ دے رہے ہیں اور ہمارے

یہاں بھی بعض نوجوان اسلام اور خصوصاً تصوّف کی ایسی ہی تفسیر کرنے کو بے قرار ہیں'' ۵

کچھ ادیبوں کا خیال ہے کہ اس تحریک تجدد نے ڈوبتے ہوئے انسان کو برآمد کیا ہے، جب کہ کچھ اس کو ایک باہر سے آنے والی اصطلاح گردانتے ہیں جس کا کوئی مصرف نہیں ہے۔لیکن اردو ادب میں وجودیت نے اپنے لیے کچھ نہ کچھ جگہ پیدا کر لی ہے۔ ہماری شاعری اور فکشن دونوں میں وجودی فکر نے موضوعات میں تنوع پیدا کیا۔تشدد، بے رحمی، انسان دشمنی، فرد کی داخلی آزادی، وجود کی فلسفیانہ توجیہہ یہ ساری چیزیں اردو ادب میں وجودیت کے توسط سے ہی پیدا ہوئیں، ڈاکٹر انیس ناگی اس کے حق میں یوں استدلال کرتے ہیں:

''اس کے اثرات اردو ادب پر بھی نظر آتے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وجودیت اور مظہریت انسان کے باطن کی دنیا تک رسائی حاصل کرنے اور اس کے افہام کے دو منہاج ہیں جن کی (Validity) ابھی ختم نہیں ہوئی۔ وجودیت ہی ایک ایسا نظریہ ہے جس نے ۲۰ ویں صدی میں ادب کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور اسی کے حوالے سے ادب میں انسان اور اس کی دنیا کو سمجھنے اور اسے اپنے آپ سے مربوط کرنے کا ایک نیا پرسپشن پیدا ہوا ہے۔ ۶

ڈاکٹر انیس ناگی کی رائے کے متضاد رائے ہمیں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی ملتی ہے۔جن کا خیال ہے کہ ''وجودیت کوئی فلسفہ نہیں، یہ مایوسی کا ایک رویہ ہے۔ ۷

لیکن ریاض احمد کے مطابق وجودیت کا نقطۂ خاص اس کی داخلیت ہے۔ ۸

وجودیت کا فلسفہ تنہائی اور بیگانگی یا غیریت کا فلسفہ ہے۔ یہ اس دور کی پیداوار ہے جب انسان اپنی تمام اقدار کھو بیٹھتا ہے، مذہب سے مایوس ہو جاتا ہے اور جب اسے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے۔ یہ دور یورپ میں عالمی جنگوں سے پیدا ہوا۔۔۔جنگوں نے اخلاق اور مذہب کو تباہ کر دیا۔نوجوانوں کو احساس ہوا کہ ماضی کا اخلاق ان کے مسائل اور مذہب کی طفل تسلیاں ان کی بے چینی دور نہیں کر سکتیں۔اگر پرانی اقدار ختم ہو چکی ہیں، مذہب بھی ناکارہ ہو چکا ہے اور فلسفہ دور از قیاس باتوں کا مجموعہ بن گیا ہے تو انسانی درد کا مداوا کیا ہے؟ اس سوال کا جواب وجودیت نے پیش کیا ہے۔ ۹

اردو ادب میں وجودیت کے براہِ راست اثرات بہت کم پائے جاتے ہیں، تاہم یہ عناصر ہمارے شعرا اور ادبا کے ہاں کسی نہ کسی شکل میں ضرور نظر آجاتے ہیں، اُردو ناول میں وجودی عناصر کی کارفرمائی نسبتاً زیادہ ہے۔آج کے حالات کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو عیاں ہو گا کہ آج کا انسان اسی داخلی کرب کا شکار ہے، جو پہلی اور دوسری جنگ کے دوران تھا کیونکہ آج ایٹم بم نے انسان کو پھر سے عدم تحفظ، صنعتی سماج نے تنہائی اور دہشت کا شکار کر دیا ہے۔ چونکہ کوئی بھی آج کا ادیب اپنے حالات سے کنارہ کشی کر کے کوئی بھی فن پارہ تخلیق نہیں کر سکتا لہٰذا اس کی تحریروں میں وجودی کرب کی جھلک نظر آنا ایک لازمی امر ہے یہی لایعنیت اور مغائرت انسان کو اس کے خارج سے نکال کر داخل کی طرف دھکیل دیتی ہے۔قیام پاکستان کے بعد کے حالات، ملک میں اظہار پر پابندی، مارشل لاٗ، ملک کا دو حصوں میں تقسیم ہونا یا آج کا معاشی اور سیاسی بحران یہ سب عناصر مل کر کسی بھی اردو ادب کے فن پارے میں وجودی کرب کا باعث بنتے ہیں، اسی لیے مغرب کے برعکس اردو ادب میں یہ وجودی عناصر بکھری ہوئی شکل میں نظر آتے ہیں۔

''اردو کے ادیبوں میں وجودی اور غیر وجودی کا امتیاز کرنے کا سوال ہی نہیں کیونکہ کوئی بھی شاعر، ناولسٹ یا افسانہ نگار اس مکتبِ فکر کا ہیرو ہے نہ مفسّر لیکن جدید عہد کے بہت سے شاعروں ،افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں کے یہاں وجودیت کے عناصر منتشر حالت میں

مل جائیں گے۔ ۱۰؎

قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' کے آغاز میں درج ایلیٹ کی نظم کے جو مصرعے درج کیے گئے ہیں ان میں وقت اور موت کے سامنے انسان کی بے بسی کا نوحہ ملتا ہے۔ سارتر کے خدا کے تصور کو رد کرنا زندگی کی لایعنیت کا نوحہ ہے قرۃ العین کے ہاں یہ تصور اس طرح سے ملتا ہے کہ مہاویر کہتا ہے:

''خداوندِ عالم کا کوئی وجود نہیں دنیا ابدی ہے اور اپنے وجود پر قائم اور مادہ اور خلا اور دھرم اور روحوں کی ترکیب سے بنی ہے صرف یہی ایک حقیقت ہے'' ۱۱؎

اور شاکیدنی کہتی ہے :

خدا ہو یا نہ ہو، حقیقت محض یہ ہے کہ دکھ موجود ہیں۔ باسٹھ فلسفے اودیا کے باسٹھ گن ہیں۔ محبت بے کار ہے، فلسفہ بیکار ہے، سب مہالوہ ہے، سب مایا ہے، سب دھوکہ ہے، شروع میں نہ وجود تھا اور نہ عدم وجود، ہر شے خلائی غیر حقیقی ہے۔ ۱۲؎

اس ناول میں یہ بتایا گیا ہے کہ وقت درحقیقت آگ کا دریا ہے جس کے سامنے انسان بے بس ہے اور اپنی تمام تر قوتِ برداشت، علمیت، ذہانت، فہم اور شعور کے باوجود ایک حقیر تنکے کی طرح ہے جو تاریخ کی جبریت کے سامنے بے بس ہے۔ ۱۳؎

آگ کا دریا میں وجودیت کے بنیادی عوامل وقت اور انسانی وجود کی اس میں شرکت، زندگی کا انجام، یعنی موت اور انسانی نسل کی مسلسل بقاء کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

قرۃ العین حیدر کے ایک اور ناول ''گردشِ رنگ چمن'' میں بھی زندگی کی جبریت کا شکار افراد اور ان کے ذہنی فشار کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول کی ہیروئین ''عندلیب'' ایک (Absurd) کردار ہے۔ حالات کی جبریت نے اسے اس پیشے کو اختیار کرنے پر مجبور کیا ہوا ہے جو اس کے داخل سے میل نہیں کھاتا لیکن وہ ایسا کرنے پر مجبور ہے اس کی یہ بغاوت اس کے مکالموں میں کئی جگہ جھلکتی ہے۔

''نہ میں آپ کا دین قبول کرتی ہوں، نہ آپ کا خدا اور نہ آپ کا پیشہ'' ۱۴؎

خواجہ مبنہ پوش کے کردار میں بھی لایعنیت جھلکتی ہے۔ قرۃ العین کے ناول ''سیتا ہرن'' میں اس کی مرکزی حیثیت کا حامل کردار سیتا میر چندانی ہے جو جمیل سے شادی کر کے خود کو ایک نئے کلچر میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس کے ٹھکرانے کے بعد بکھر جاتی ہے اور اپنے وجود کے عدم تحفظ کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے وہ مختلف مردوں کے ہاں پناہ ڈھونڈتی ہے لیکن کوئی بھی اس کی وجودی حیثیت کو نہیں مانتا۔ اس کی صورت حال پر ڈاکٹر فاروق عثمان لکھتے ہیں۔

> ممکن ہے یہاں مرد کے کردار کے استحصالی رویے کی وہ شدت نظر نہ آئے جس کی طرف سیتا ہرن کا استعارا اشارہ کر رہا ہے۔ کیونکہ یہاں مردوں کی طرف رغبت اور جھکنے میں اسطوری سیتا کے برعکس ناول کی سیتا میر جندانی کا اپنا انتخاب بھی شامل ہے لیکن پھر بھی اس کے المیے کی اثر انگیزی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو ''وجودیت'' کے سیاق وسباق میں آزادی عمل کے ساتھ بروئے کار آتا ہے اور اسے تنہائی کے کرب شکستِ خواب اور جلاوطنی کے احساس میں غرق کر دیتا ہے یہاں آشوبِ ذات کی تہہ میں جو بنیادی عنصر ہے وہ وہی قرۃ العین حیدر کے نظام فکر کا مرکزی تصوّر ہے۔ ''یعنی تہذیبی اور ثقافتی تشخص کا شعور'' یہ اسی شعور کی گمشدگی ہے جو سیتا میر چندانی کو منزل منزل بھٹکاتی پھر رہی ہے۔'' ۱۵؎

قرۃ العین نے محض عورت کے استحصال کی نشاندہی ہی نہیں کی بلکہ انہوں نے ایک ایسے بے چین نفس کی عکاسی کی ہے جسے وقت کی جبریت نے اپنے فطری اور جذباتی رشتوں سے دور کر دیا ہے۔ گویا وہ وجودی سطح پر جبریت کے شکار کرداروں کی عکاسی کر رہی ہیں۔ وجودی نقطہءنظر کے مطابق اگر انسان اپنے داخل کے ساتھ ہو تو وہ صادق کہلاتا ہے۔ انتظار حسین سماجی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ تحلیلی اور داخلی انداز کو اہمیت دیتے ہیں اور مؤخرالذکر رویہ ہی ان کے فن پر غالب ہے۔

''وجودی فکر کوئی ایسی متعینہ فلسفیانہ فکر نہیں ہے کہ ہر ہر سطر میں آئینہ ہو جائے بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ افسانہ نگار یا فنکار (Art Lies in Concealing Art) کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر فکری پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ انتظار حسین کے یہاں یہ صورت ابھرتی ہے۔ وہ وجود کے مسئلے پر ایک فلسفی کی حیثیت سے بحث نہیں کرتے بلکہ اسے فن کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں۔'' ۱۶

انتظار حسین نے اپنی تخلیقات میں ہجرت، تقسیم اور ان سے پیدا ہونے والی نفسیاتی شکست و ریخت کو موضوع بنایا ہے۔ ان کا ناول ''چاند گہن'' بھی اسی موضوع کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے کردار بُو جی، ان کا بیٹا سبطین، کالے خان اور فیاض وغیرہ جو حسن پور (یوپی کا ایک قصبہ) میں صدیوں سے آباد تھے ان کو فسادات کی وجہ سے دہلی آنا پڑا، دہلی کو بھی غیر محفوظ پا کر وہ لاہور پہنچ جاتے ہیں۔ لاہور میں ابتدائی دنوں کے اثاثوں کی تقسیم پر جو کشاکش ہے وہ اس ناول میں ایک ایسی فضا پیدا کر دیتی ہے جو انسان کو مسلسل کرب کا شکار کر دیتی ہے ایک ایسا کرب یا درد جس کا مداوا نہ دین کے پاس ہے اور نہ ہی مذہب کے پاس۔ سبطین دہلی کے اس خوف کے سائے میں پلنے والی پہاڑ جتنی لمبی رات کا بیان یوں کرتا ہے۔

> ''ایک خوفناک ہنگامہ خیز رات ہے، جس نے پوری دلی کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ رات محلّہ کے ہر شخص کو یقین تھا کہ حملہ ہوگا مگر نہیں ہوا۔ قیامت سر پر آ کر ٹل جاتی ہے یہ تذبذب کی کیفیت سخت اذیت ناک ہے قیامت کو اگر ٹوٹنا ہی ہے تو ٹوٹ کیوں نہیں پڑتی ہے یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ مجرم کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر دیا جائے اور جلاّد کہیں کہ ہم حقہ پی کر آتے ہیں۔ پھر تجھے پھانسی لگائیں گے۔ یہ پورا محلّہ پھانسی کے تختے پر کھڑا ہے پھانسی کا پھندا سر پر لٹک رہا ہے گلے میں نہیں آتا۔ ۱۷

ناول اپنے اختتام تک ایسی فضا میں سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے جس میں گھٹن اور اداسی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس ناول کے تمام کردار زندگی کی بے معنویت، لغویت، بے مقصدیت اور فرد کی اپنی ذات کی تنہائی کا شکار ہیں۔ یہی عدم تحفظ کا احساس اس ناول کے مرکزی کردار ''سبطین'' (Nausea) کے مرکزی کردار کے مشابہ کر دیتا ہے وہ ناول کے آخر تک انفعالیت کے بوجھ تلے دبا ہوا کسی بھی قسم کی آزادیٔ انتخاب کے بغیر مایوسیوں میں کھو جاتا ہے۔

انتظار حسین کا ناول ''آگے سمندر ہے'' کراچی کی موجودہ صورت حال کی نمائندگی کرتا ہے اس ناول میں بھی تمام کردار ماضی اور حال کی کشمکش کا شکار ہیں اور خوف کی فضا ہے جو تمام ناول میں یاسیت کی فضا کو جنم دیتی ہے۔ مثلاً آغاز ہی میں محبو بھائی کہتے ہیں۔ ''اماں باؤلے ہوئے ہو، سمندر کے کنارے بسے ہوئے شہر کی کہیں جڑیں ہوا کرتی ہیں وہ تو پانی پہ تیرتا ہے۔'' ۱۸

اس پورے ناول کی فضا میں زندگی کی بے معنویت اور بے یقینی کی کیفیت موجود ہے جانے کس لمحے کیا ہو جائے، ایسی صورت حال میں نفسیاتی کشمکش یا زندگی کی جبریت کا احساس افراد کی ذہنی پہچان کا باعث بنتا ہے۔ یہ اذیت اس وقت اور زیادہ کربناک ہو جاتی ہے جب غازی عطاءاللہ کے جلسے میں بم پھٹتا ہے اور محبو بھائی بھی مر جاتا ہے۔

''مجو بھائی کا غائب ہو جانا علامت ہے بیرونی دنیا کے ساتھ جواد کا رابطہ ٹوٹنے کی، اب اس کے اپنے جسم کا ایک حصّہ غائب ہو گیا ہے اب وہ ہے اور اس کا ماضی قدیم تاریخ۔'' ۱۹

زندگی کی لایعنیت کا تصّور ہی انتظار حسین کے ناولوں میں وجودی کرب پیدا کر دیتا ہے۔ جب حالات کی جبریت اس کے کرداروں کو مجبورِ محض کا شکار کر دیتی ہے تو فضا وجودی صورت حال کی عکاس بن جاتی ہے۔

خالدہ حسین کے ناول ''کاغذی گھاٹ'' پر کافکا اور سارتر کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس ناول میں بکھرے ہوئے موضوعات میں انسانی تنہائی، عدم ابلاغ، خود شناسی، موت کا اذیت بھرا خیال، ذات کا آشوب، اجنبیت، آگہی کا کرب یہ سبھی شامل ہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

''موت کی خاموش دہشت اندر ہی اندر اس کے دل میں بیٹھتی جا رہی تھی یہ زندگی کا ایک غیر ضروری، انتہائی نا وقت اختتام جو تلوار کی طرح سر پر لٹکتا ہی رہتا ہے اور سایہ کی طرح پیچھا کرتا ہے اور ہونے کا احساس شدید کرنے والا اور نہ ہونے کا ''می نومی نا'' اس کے احساس میں بُری طرح جڑ پکڑ چکا تھا اور کسی فلم کی پسِ منظر موسیقی کی طرح ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ رہتا۔'' ۲۰

ڈاکٹر سہیل احمد خان خالدہ حسین کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''خالدہ حسین کا فنی سفر تو شروع ہی سادہ منطق کی لکیروں کے پار سے ہوتا ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں ان کہانیوں کے کرب اور ان کی احساساتی شدت نے لوگوں کو چونکا دیا، ان کا رشتہ وجودی کرب سے جوڑا گیا۔ ۲۱

اس پورے ناول میں ہونے اور نہ ہونے کا کرب دکھائی دیتا ہے اس احساس نے تمام کرداروں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے اور ان کرداروں کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر پسپائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مونا کا کردار تو مکمل طور پر ایک ''وجودی فرد'' کا کردار ہے سارتر کے انتخاب کا مسئلہ اُسے الجھاتا ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ انتخاب تو پہلے سے طے ہے لیکن حسن اُسے کہتا ہے:

''یہ انتخاب اتنے آسان نہیں۔ سارتر نے اسی آزادیٔ انتخاب کی آزادی کو زندگی کی اساس بتایا ہے یعنی انسان ہر لمحہ انتخاب کرتا ہے اور اذیت میں گرفتار رہتا ہے۔ زندگی بلیک اینڈ وائٹ نہیں اس کا اکثر حصّہ گرے ہے مجھے دیکھو، میرے اندر ایک تخلیقی آدمی دن رات دھوم مچاتا ہے میں سوچتا ہوں ابھی میں اس کی تشفی کا سامان کرونگا۔ مگر میں دو ٹکے کی نوکری میں اپنے آپ کو ضائع کرنے پر مجبور ہوں۔۔۔۔۔ جابر نظام کی غلامی مجھ میں اپنے آپ سے نفرت پیدا کرتی ہے۔ ۲۲

اس تمام صورت حال میں مونا کو کچھ بھی نظر نہیں آتا سوائے متلی کے ''دنیا میں کچھ بھی نہیں، کہیں کچھ بھی نہیں، سوائے ایک گھنی متلی کے'' ۲۳

اس ناول میں وجودی صورت حال کی وجہ قیام پاکستان سے پہلے اور بعد کے حالات، تیسری دنیا میں اہم سیاسی اور معاشی مسائل اور ایسے حالات میں فرد کی شکست و ریخت بنتی ہے۔ خالدہ حسین نے اسی فضا میں کرداروں کے نفسیاتی اور فکری پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔

عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' افراد ہی کا نہیں بلکہ نسلوں کا نوحہ ہے۔ جاگیرداروں کا استحصال، غربت، ہجرت، سیاسی واقعات اور پھر ان کے انسانی نفسیات پر اثرات، انہیں ذہنی اور خارجی سطح پر بے معنویت کا شکار کر دیتے ہیں۔ وسیع پیمانے پر اموات، تلخ تجربات، وقت اور تاریخ کا ٹکراؤ، جزا و سزا ایسے عناصر ہیں جو اس ناول کو وجودیت کے قریب کر دیتے ہیں۔

''باگھ'' میں بھی جبر و تشدد کے ذریعے انسان کو Absurd دکھایا گیا ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار اسد کا بھی سب سے بڑا

مسئلہ Alienation نظر آتا ہے اس کا انجام بھی کافکا کی کہانیوں کی طرز کا دکھایا گیا ہے۔
ڈاکٹر خالد اشرف لکھتے ہیں کہ

''باگھ'' کے اسد علی کی گرفتاری، رہائی اور دوبارہ گرفتاری کافکا کے ''دی ٹرائل'' کی یاد تازہ کر دیتی ہے جہاں ایک بے گناہ شہری کو بغیر کسی قانون شکنی یا جرم کے ایک دن پکڑ لیا جاتا ہے اور لوگ بتاتے ہیں کہ کل اس کو عدالت میں پیش ہونا ہے۔ اسد بھی ''دی ٹرائل'' کے بے گناہ ہیرو کی طرح کسی سیاسی تحریک یا مکتبِ فکر سے وابستہ نہیں ہے بلکہ کافی حد تک مجہول نوجوان ہے جو تادمہ کا مریض ہے اور نیم تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ نہایت معمولی قسم کی شخصیت کا مالک ہے۔'' ۲۴ کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

عبداللہ حسین کے ناول قید میں بھی انسان کو کہیں حالات کی، کہیں عشق کی، کہیں استحصال کی، کہیں غلامی کی اور کہیں ضمیر کی قید میں دکھایا گیا ہے۔ ناول ایک واقعے کے تاروپود سے جڑا ہوا ہے جس میں ایک نوزائیدہ بچے کو مذہب، اخلاقیات اور تقدس کے نام پر مسجد کی سیڑھیوں پر پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جاتا ہے اس ناول میں معاشرے کے استحصالی رویے اور سوسائٹی کی نفسیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''وہ انسان کی بے بسی اور خواہشات کی عدم تکمیل سے پیدا شدہ مسائل کو وجودی انداز میں دیکھتے ہیں۔'' ۲۵

اداس نسلیں، باگھ اور قید میں عبداللہ حسین نے شعوری یا غیر شعوری دونوں طرح سے وجود کا مسئلہ ابھارا ہے ان کی تحریروں میں ٹالسٹائی، ہیمنگوے، ٹی ایس ایلیٹ اور کافکا سے متاثر ہونے کی بناء پر وجودی عناصر در آتے ہیں۔

نثار عزیز بٹ کا ناول ''کاروانِ وجود'' خالصتاً وجودی ناول ہے اس میں وجودیت کی حمایت میں دلائل و مباحث کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ اقبال کی نظم ''ساقی نامہ'' کے اشعار اس کے موضوع کا تعین کرتے ہیں۔ اس ناول میں کہانی دو کرداروں کے گرد گھومتی ہے جن میں سے ایک ثمر اور دوسرا سارہ کا ہے، ثمر کا کردار وجودی عناصر اور سارہ کا کردار عینیت پسندی کے نظریے کو اجاگر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ثمر کا کردار اپنے اندر سحر انگیزی اور پراسراریت سموئے ہوئے ہے ناول کے ابتداء سے اختتام تک اسی کی دلکشی، سحر اور آزادیءافکار کو عملی صورت میں دکھایا گیا ہے۔

ثمر کے کردار میں انتخاب و عمل کی آزادی کا عنصر وجودیت کا مظہر ہے وہ اپنی مرضی سے زندگی گزارتی ہے وہ میشل سے محبت کے باوجود اس کا معروض بننا پسند نہیں کرتی، اسی طرح جب حسن رضا سے شادی کرتی ہے تو بھی تنسیخِ نکاح کا حق اپنے پاس رکھتی ہے۔ وجودی مفکرین جمالیاتی مادیت پرستوں کی طرح لذتیت کے حامی نہیں ثمر کا کردار بھی اس انکار کی عکاسی کرتا ہے۔ ثمر کے نزدیک زندگی کی ہر راہ پر کانٹے ہی کانٹے ہیں اور ہر چیز یہاں تک کہ کوئی خوشی بھی ملتی ہے تو بھی اس کی کوئی نہ کوئی قیمت چکانی پڑتی ہے یہی وجودی فکر کی اساس ہے۔

''چت بھی قیمت، پٹ بھی قیمت اور یک مشت نہیں ایک ساتھ نہیں لحظہ لحظہ ہر آن، قسط در قسط، قیمت، قیمت، قیمت، بچپن کا حساب دو، جوانی زناٹے سے گزرتی دیکھو، بڑھاپے کا سامان کرو، پھر بڑھاپے کا کشٹ اُٹھاؤ۔ اس کٹھن راہ کے اختتام پر جانکنی کا عذاب اور ابدی دوزخ کا ہوا۔ اتنی بڑی قیمت چند سانسوں، چند رنگوں، چند ذائقوں کے لیے؟؟ ۲۶

ثمر اپنے داخل میں اس قدر گم ہے کہ اس کو گردوپیش سے کوئی غرض نہیں وہ اُڑتے ہوئے پرندے، بادل اور فطرت میں خود کو دیکھتی ہے اور مسحور ہوتی ہوئی نظر آتی ہے وہ گلہری کی جون میں خود کو دیکھ کر سرشاری اور آزادی کی کیفیت کو محسوس کر سکتی ہے۔

انیس ناگی نے اپنے ناولوں میں جدید عہد کے سیاسی و سماجی بحران کو وجودی فکر سے ہمکنار کیا ہے انہوں نے اردو ناول کو دوستوفسکی، کافکا، آندرے ژید، سارتر اور کامیو کی روایت سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ان کے فن پر مغربی ناول کے اثرات غالب ہیں۔۔۔۔ان کے ناولوں کے کردار پاکستان کی صورتِ حال کو اپنے داخلی کرب کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ان کے ناول دیوار کے پیچھے، میں اور وہ، زوال، ایک گرم موسم کی کہانی، ایک لمحہ سوچ کا، قلعہ، محاصرہ، چوہوں کی کہانی، پتلیاں، کیمپ، ۳۱۳ بریگیڈ اہم ہیں ان کے ناولوں کے موضوعات اچھوتے اور متنوع ہیں۔

ان کا ناول ''دیوار کے پیچھے'' ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔اس ناول میں فرد کے وجودی بحران اور کرب کا اظہار ملتا ہے۔اس کا مرکزی کردار پوری سچائی کے ساتھ اپنی مرضی سے زندہ رہنا چاہتا ہے لیکن معاشرے میں اس سچے آدمی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔اس کا سامنا ایسے نظام سے ہوتا ہے جو غیر جمہوری، غیر منصفانہ اور منافقت سے پُر ہے اس ناول کے حوالے سے قاضی جاوید لکھتے ہیں۔

> ''دیوار کے پیچھے'' اس مردود شہر میں فرد کی سرگزشت ہے جس کی ساعت میں فرق آچکا ہے، جس میں عظمت اور امان نہیں محض سفلہ پن اور طمع ہے جس میں جانا جرم کے مساوی ہے، جہاں تمام رشتے ٹوٹ چکے ہیں، فرد اپنی شناخت کھو چکا ہے، وہ کسر یکشن کیمپ میں اپنے نمبر کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے اس میں بہتا ہوا فرد اپنے تئیں عضویاتی کل بھی محسوس نہیں کرتا اپنے آپ سے بے بس اور حالات کے جبر کا شکار ہے۔ یہاں زندگی مطلق کے افق اور ابدیت کے افق کے بغیر بسر ہوتی ہے اس کا المیاتی احساس بھی فنا ہو چکا ہے۔ ہلاکت پسندی اس شہر کا حوالہ ہے۔ ۲۷

اس ناول کا مرکزی کردار حالات سے تنگ آ کر خودکشی کرنا چاہتا ہے لیکن وہ مرنے پر بھی بے اختیار اور بے بس ہے۔ وہ اس زندگی کو جینا نہیں چاہتا لیکن اس کو جینا پڑ رہا ہے۔''میں اور وہ'' انیس ناگی کا دوسرا ناول ہے اس کا موضوع بھی جبریت ہے اور مرکزی کردار قنوطیت اور معاشی نا ہمواری کا شکار نظر آتا ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار بھی داخلی اضطراب کا شکار ہے۔اس اضطراب کی وجہ ماحول سے عدم مطابقت، معاشرے کی بیچارگی کا احساس اور داخلی انتشار ہے۔

> ''۔۔۔۔میں کسی لغو سوچ میں کھو گیا ہوں، ماضی؟ یہ مجھے کیا دے سکتا ہے؟ اس طرح تو مستقبل بھی لغو ہے کہیں بھی روشنی کی کرن نہیں ایک مایوسی ہے، اعتماد کی کمی ہے، ہر ایک سے خوف آتا ہے حال نے کون سی مشکل آسان کر دی ہے کہ میں زمانوں کا گلہ کروں، ہر زمانہ مجھے وقت کے درمیان چھوڑ کر نکل جاتا ہے اور میں وقت کے لمحات گنتا گنتا زندگی میں کچھ کئے بغیر، عمر کی اس دہلیز پر محو سوچ ہوں جس کے آگے زوال، بیماری اور انہونے خوف نہیں۔۔۔ ۲۸

اس سارے ناول میں کشمکش کی صورت حال عدم مفاہمت کی وجہ سے ہے اگر مرکزی کردار ماحول سے مفاہمت کرے تو وہ مغائرت کے احساس سے نکل سکتا ہے لیکن مفاہمت اس کی ذات کی نفی کا نام ہے۔اس کا شعور ہی اس کی سزا بن جاتا ہے۔

انیس ناگی کے ناول ''زوال'' کی کہانی ذہنی، جذباتی اور فکری زوال کی کہانی ہے۔اس ناول میں اپنے عصر کی گھٹن کو پیش کیا گیا ہے۔ سطحی طور پر ''زوال'' کے ہیرو کی کہانی ''فرانز کافکا'' کی کہانی ''کایا کلپ'' کے مرکزی کردار ''رسا سا'' سے بہت ملتی ہے۔کافکا کی نسبت انیس ناگی نے علامتوں کو تفہیم کے قریب قریب رکھا ہے۔

''ایک لمحہ سوچ کا'' سقوط دہلی سے متعلق ہے اس ناول کا ہیرو رحمان، دوسو سال پہلے پرانی دلی میں پہنچ جاتا ہے یوں تاریخ کا تسلسل جاری رہتا ہے اس عہد کی معاشرتی، سماجی، ثقافتی زندگی کو جس طرح نہس نہس کیا گیا اس کا بیان اس ناول میں بڑی کربناکی سے ملتا ہے۔

''ایک گرم موسم کی کہانی'' انگریز حکمرانوں کی ڈائریوں سے مرتب کیا گیا ناول ہے اس میں Flash' Back کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ جس سے ناول میں بیان کردہ واقعات میں Authenticity پیدا ہوگئی ہے ناول میں دو موضوعات ملتے ہیں ایک تو فرد کا بیوروکریٹک نظام سے ٹکراؤ اور دوسرا فرد کی اپنی ذات کی تلاش کا ہے۔ محمد علی صدیقی اس ناول کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''انیس ناگی کا یہ تاریخی ناول ''ایک گرم موسم کی کہانی'' ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بارے میں ایک نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر ایک معاشرہ سیاسی طور پر مغلوب ہو جائے تو اس مردنی کے باوجود اس میں ایسے باحوصلہ افراد بھی موجود ہوتے ہیں جو اجتماعی وجود کی بقاء کے لیے انفرادی وجود کی قربانی دیتے ہیں یہ ایک تاریخی انتخاب ہوگا جو اس ناول کا موضوع ہے۔'' ۲۹

''محاصرہ'' بھی انیس ناگی کا اہم ناول ہے جس کے تمام کردار Absurd ہیں اور یہ سب معاشرے کی منفی قوتوں کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ یہ ناول بھی پاکستان میں ہونے والی لوٹ کھسوٹ، کرپشن، بے عملی، بے حسی اور اداروں کے کھوکھلے نظاموں پر لکھی گئی ایک دستاویز ہے جس میں منفی عناصر کو ان کے اصلی چہروں کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔

''پتلیاں'' میں وجودی عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں اس کے تمام کردار تیسری دنیا میں سانس لیتے نظر آتے ہیں اور معاشرے کی استحصالی اور بے توجہی کا شکار ہیں۔ اس لیے معاشرے سے بیگانہ ہو کر موت کو اہمیت دیتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار جمیل ہے جو ایک کنبے کا سربراہ ہے۔ بلند آدرش کا حامی جمیل اپنے سے بالکل متضاد ماحول میں سانس لے رہا ہے جس میں کسی آدرش یا آئیڈیلزم کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ نامساعد معاشی حالات کے ہاتھوں تنگ آ کر خودکشی کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

> سب کچھ بیت چکا ہے، میں اپنی ذات کی ذمہ داری بھی قبول نہیں کر سکا اور زندگی کو ایک پتلی کی طرح بسر کیا جس کا اختیار کسی اور کے ہاتھ میں تھا، زندگی رائیگاں گئی اور میرے پاس زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں تو پھر واقعی زندہ رہنا ضروری ہے؟ میں ۔۔۔۔۔ میں نے زندہ رہنے کے لیے جو رشتے بنائے وہ سب عارضی تھے، ازلی تنہائی سے بچنے کے حربے تھے، جب موت کی طرف قدم اُٹھاتے ہوئے جانا ہے تو پھر سب رشتے بے معنی ہیں اور بے معنویت میں کب تک زندہ رہا جا سکتا ہے؟ ۳۰

اس ناول میں وجودی مسائل کو کرداروں کے ذریعے ابھارا گیا ہے۔ پروین اور راحت کے مکالمے دراصل وجودیت کے ہی عکاس ہیں انہی کرداروں کے ذریعے انتخاب کی آزادی اور پھر اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے کرب کی صورت حال، اور اس کیفیت کے سامنے بے بسی کا نوحہ، یہ سب لایعنیت کا موثر پیرائے میں اظہار ہے۔

''۳۱۳ بریگیڈ'' بین الاقوامی دہشت گردی کے موضوع پر لکھا گیا ناول ہے۔ جس میں غیر جانبداری سے دہشت گردی کے محرکات کا جائزہ لیا گیا ہے ناول میں انسانی وجود کی ماہیت اور اس کی معنویت پر بھی سوال اٹھائے گئے ہیں۔

مجموعی طور پر انیس ناگی نے وجودی صورت حال پیدا کرنے کے لیے تیسری دنیا کے مسائل کو پیش کیا ہے جس سے خود ہی فرد کی داخلی کشمکش، ذات کے بے معنویت کا احساس اور زندگی کا لغو ہونے کے احساس نے ان ناولوں کو وجودی ناول بنا دیا ہے۔ لیکن انیس ناگی کی اس کاوش نے

جہاں اردو ناول کو ایک نئے ذائقے سے آشنا کیا ہے وہاں قاری اور ادب کے درمیان میں کچھ فاصلے در آئے ہیں، جن کا ختم ہونا ضروری ہے وگرنہ ادیب اور قاری کے درمیانی فاصلے سے جس قسم کا ادب تخلیق ہوگا وہ زوال آمادہ ادب ہوگا۔

انور سجاد کا نام بھی جدید ناول نگاروں میں اہمیت کا حامل ہے۔ان کے تین ناول رگِ سنگ، خوشیوں کا باغ اور جنم روپ اپنی انفرادیت کی بناء پر اردو ناول نگاری میں خاص مقام رکھتے ہیں انسان کی تنہائی، اضطراب، تشویش، تقدیر کی ستم ظریفی اور لایعنیت خاص موضوع ہیں ان تمام موضوعات میں تشخص کی تلاش کا مقصد سرگرداں نظر آتا ہے۔

انور سجاد کا ناولٹ ''رگِ سنگ'' کا موضوع بھی انسان کی تنہائی اور اس کی بے بسی ہے وہ اپنے اردگرد انسانوں کو اپنے مشاغل میں گم دیکھتا ہے جس میں کئی انسانوں کی زندگیاں بھی جھونکیں جا رہی ہوتی ہیں۔اسی قسم کے معاشرے سے اس ناولٹ کا مرکزی کردار جنم لیتا ہے اس کی تکمیل کے لیے ہر حد سے گزرنے نہیں دیتیں اسی کشاکش میں اس کے جذبوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اور وہ تنہائی کے کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

''اب وہ اللہ میاں سے بھی زیادہ اکیلا تھا۔کیونکہ اللہ میاں کی تو بہت سی دنیائیں ہیں
مگر اس کی دنیا نہیں تھی جسے وہ اپنا سمجھتا۔'' ۳۱

''جنم روپ'' بظاہر تو ایک عورت کی کہانی ہے جس نے ایک ایسے معاشرے میں آنکھ کھولی جس کی بنیاد غیر انسانی قدروں پر تھی۔انور سجاد اس عورت کو ایک ایسی علامت بنا کر پیش کرتے ہیں جس سے پوری تاریخ کیا پوری زندگی کو سمجھا جا سکتا ہے۔اس ناول میں پر تشدد فضا میں تخلیقی رویوں کی صورتِ حال کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے عورت کے اس تصور کے بارے میں ڈاکٹر عقیلہ جاوید لکھتی ہیں:

> ''انور سجاد اپنے ناولوں میں عورت کے اندر جھانک کر اس کے دُکھ اور کرب کی تہہ تک پہنچتے ہیں اس کرب کا ذمہ دار مرد کا جبر اور اس کی حاکمیت ہے وہ اس کے فطری جذبات کی رعنائیوں کو روندتا ہے اور اس کا تمام اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے یہ ایک المیہ ہے کہ ہمارے معاشرے کی عورت معاشی اور نفسیاتی مسائل کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ ۳۲

اس ناول میں عورت کے کرب کی داستان کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ یہ کرب اپنی پہچان کے نہ ہونے، اپنی ذات پر اپنا اختیار نہ ہونے کا ہے جو اس عورت کے کرب کو وجودی کرب میں ڈھال دیتا ہے۔

''خوشیوں کا باغ'' انور سجاد کا اہم ناول ہے، اس ناول کا ابتدائی جملہ اس کے موضوع کا تعین کر دیتا ہے۔

''بوش کے خوشیوں کے باغ کا ہر پینل ایک دنیا ہے اور تیسرا پینل، تیسری دنیا'' ۳۳

استحصالی رویوں کے خلاف اس ناول میں احتجاج اور مزاحمت کا رنگ نمایاں ہے۔ناول میں تیسری دنیا کے سب سے بڑے مسئلے ''غربت'' کو ایک چیف اکاؤنٹنٹ کے کردار کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس ناول میں صرف غربت کو ہی موضوع نہیں بنایا گیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان تضادات کو پیش کیا گیا ہے جس میں سیہ ہی قانون بناتا ہے اور سیہ ہی قانون توڑتا ہے۔اس تفریق سے پیدا ہونے والی داخلی صورت حال کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، داخلی حقیقت پسندی اور منفی جذبات کو طنزیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔زندگی کی یہ بے معنویت، انسانی زندگی کے بارے میں وجود کے بارے میں ابھرنے والے کی یہ بے معنویت، انسانی زندگی کے بارے میں، وجود کے بارے میں ابھرنے والے سوالات اس ناول کو وجودی بنا دیتے ہیں۔

فہیم اعظمی اردو ناول نگاری اور افسانہ نگاری میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔کامیو کا Absurdity کا تصور ان کے دونوں ناولوں ''جنم

کنڈلی'' اور ''ڈسٹی نیشن مین ہول'' پر واضح اثر رکھتا ہے۔

''جنم کنڈلی'' کشکول ایک علامت بن کر ابھرتا ہے۔ جسے سرمایہ دار طبقے کی ہوس کی علامت کہا جاسکتا ہے۔ اور یہ کشکول کبھی بھرتا نہیں ہے۔

''اس کو کشکول خالی ہونے کا ڈر ہمیشہ ستاتا رہا اور اس کا کشکول پوری طرح کبھی نہ بھرا''۔ ۳۴

کشکول کی علامت کے حوالے سے انجم اعظمی لکھتے ہیں۔

''کشکول اس عہد کی بنیادی علامت ہے جو اس ناول کے موضوع کی مرکزیت کو قائم رکھتی ہے ایک اور اعتبار سے دیکھا جائے تو موضوع کی انفرادیت اور نکھر کر سامنے آتی ہے۔۔۔۔ کہ کلاسیکل شعرا نے کشکول یا پیمانے کو صرف تشبیہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جبکہ فہیم اعظمی نے زندگی کے کشکول کو بطور علامت استعمال کر کے اس کے نا بھرنے کی داستان میں اس عہد کے آدمی کی بے پناہ تشنگی کا اظہار کیا ہے۔ اس تشنگی میں صدیوں کی تشنگی ،اس عہد کے سینکڑوں تضادات سے مل کر سمندر کی طرح امڈ رہی ہے۔'' ۳۵

''جنم کنڈلی'' پر وجودیت کے اثرات نمایاں ہیں اس میں سارتر کے تصورات کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار Nausea کے ہیرو سے مشابہ ہے یہاں تک کہ سارتر کے ناولوں میں بعض کردار مرگی کے مریض نظر آتے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار بھی مرگی کا مریض ہے۔ مرگی لایعنیت اور بے معنویت کی علامت ہے۔

''عمارت دوسری گلی میں تعمیر ہوسکتی تھی اور پلر ز پر کھڑی ہوسکتی تھی اور کوٹھا اس سے اونچا ہوسکتا ہے یہ تو اسی منزل پر ٹھہر گئی اور وہ اس سے اوپر نہیں جاسکتا اور اس کے تکبر پر غصّہ آیا اور پھر اس نے پوٹلی اٹھالی اور اپنی بے بسی پر روتا رہا۔ اور گزرے وقتوں کو یاد کرتا رہا اور ایج آف ریزن کو گالیاں دیتا رہا۔۔۔ اور اس پر دورہ پڑتا رہا اور وہ اس حالت میں گاربج ڈمپ پر پہنچ کر قے کرنے لگا اور کاربن ڈائی آکسائیڈ سونگھنے لگا اور بہت سے کتے بلی جمع ہوگئے اور اسے ہار پہنانے لگے اور اس کی قے چاٹنے لگے لیکن وہ سوچتا رہا'' کیا یہی میری منزل ہے؟'' ۳۶

اس ناول میں انسان کی بے زمینی اور بے ثباتی کا نوحہ بھی ملتا ہے بطورِ خاص اس کا مرکزی کردار بے معنویت اور لایعنیت کے دائروں میں بھٹک رہا ہے۔

ہم جس عہد میں زندہ ہیں وہ دور بلاشبہ محرومیوں اور نارسائیوں کا دور ہے اس لیے جب بھی ادیب گہری نظر سے اپنے گردوپیش کا جائزہ لے گا تو وہ وجودی فکر کا حامل ضرور نظر آئے گا۔ اپنی وجودی عناصر کی ایک منتشر سی شکل فاروق خالد کے ناول ''سیاہ آئینے'' میں بھی نظر آتی ہے۔ اس ناول میں بھی زندگی لمحہ بہ لمحہ تاریکی اور مایوسی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں گم ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس ناول کے تمام کردار نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس طبقے کو غربت، بیماری اور لاچاری کے خلاف جس طرح جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ یہ اس ناول میں دکھایا گیا ہے اسی غربت کی بناء پر ''عزیز'' اپنا خون بیچ آتا ہے۔

''منیر صاحب، میرا جسم میرا جسم نہیں، میں نے اسے ڈاکٹر یعقوب کے پاس جا کر بیچ دیا تھا اور سارے پیسے لے کر آپ کے پاس آ گیا تھا اب میں آپ سے کہتا ہوں مجھے گھر چھوڑ آئیں اور میرے ابّا سے کہیں کہ عزیز کا جسم اس کا اپنا جسم نہیں ہے۔'' ۳۷

عزیز کی بے معنویت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے محبت بھی اس کو پناہ نہیں دے سکتی تو وہ خود کو نشہ کے دھوئیں میں گم کر لیتا ہے یہ بیچارگی اس وقت بڑھ

جاتی ہے جب اس کے باپ پر چوری کا الزام لگتا ہے یہ واقعات اسے مزید موت کے قریب کرتے چلے جاتے ہیں اور وہ خودکشی کی کوشش کرتا ہے۔

ایسی ہی صورت حال کا شکار دوسرا خاندان کلثوم کا دکھایا گیا ہے جہاں غربت کے ساتھ معذوری بھی موجود مجموعی طور پر ناول انسان کی بے بسی اور مجبوری کا نوحہ ہے جہاں تمام کردار مجبوریوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور اپنے وجود کا اثبات چاہتے ہیں۔ سارتر کے الفاظ میں انسان ہی اس کا ذمہ دار ہے۔

> ''قانون پٹے کے ساتھ بندھا ہوا کتا ہے، زیادہ نزدیک جاؤ گے تو یہ تمہیں کاٹ لے گا بلاوجہ تم پر منہ مارے گا تو تمہیں اپنی وحشت زدہ آواز ہی سے ڈرانے کی کوشش کرے گا۔ یاد رکھو کہ قانون خود نہیں مرتا بلکہ دوسروں کو مارتا ہے۔ یہ زندگی نہیں بخشتا بلکہ زندگی چھین لیتا ہے معاشرے کو چاہیے کہ وہ انسان کو انسان بننے کا موقع دے۔ انسان پر کیوں اعتبار نہیں کیا جاتا؟ کاش کہ انسان کی خصلت پر اعتبار کیا جائے، اور اگر انسان بُرا ہے تو ہر کسی کو خودکشی کر لینی چاہیے۔'' ۳۸

رحیم گل کا ناول ''جنت کی تلاش'' ایک ایسے کردار کی کہانی ہے جو مسلسل اضطراب میں ہے۔ اس کے مرکزی کردار ''امتل'' کے گرد ساری کہانی گھومتی ہے۔ ڈاکٹر اے۔ بی اشرف اس ناول کے کرائسس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ کرائسس امتل کا نہیں، آج کی اس نسل کا ہے جو ایک عہد کی پیداوار ہے جس کی Values اور اقدار اس کی اپنی وضع کردہ ہیں۔ تشکیک اور بے یقینی ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصّہ بن چکی ہے زندگی کی بے معنویت ایک مسلمہ حقیقت کا روپ اختیار کرتی جا رہی ہے زندگی اور انسان کی تخلیق بھی بے مقصد دکھائی دینے لگی ہے۔ امتل کا یہ وثوق نئی نسل کا وثوق ہے۔ ۳۹

وجودیت تعقل پسندی کا ردِعمل ہے۔ سائنس کی یلغار میں انسان کی ازسرِنو بازیافت وجودیت نے ہی کی۔ مادیت پرستی کو رد کرتے ہوئے انسان کے وجود کو اہمیت دی۔ اس ناول کی ہیروئن بھی واپس غاروں میں رہنا چاہتی ہے فطرت کے قریب رہنا چاہتی ہے۔

> ''دنیا مادی ترقی میں بہت آگے نکل گئی ہے مگر اس کا نقصان یہ ہوا کہ سائنسی ترقی نے انسان کو مشین کا پرزہ بنا دیا۔۔۔ آپ کی طرح میری طرح، میرے ساتھیوں کی طرح شعور نے اسے غار سے نکالا تھا۔ اب شعور ہی اسے واپس غار کی طرف دھکیل رہا ہے۔'' ۴۰

یہ پورا ناول وجودی عناصر سے بھرا پڑا ہے اس کا موضوع ہی انسان کی خوشیوں کے لیے راحت کے لیے جستجو کا سراغ دیتا ہے۔ جس میں وہ کسی جنت کی تلاش میں سرگرداں ہے لیکن یہ جنت کہیں نہیں ہے بلکہ ایک دوزخ ہے جس میں انسان کی زندگی، اس کی خواہشات اس کے جذبات اور تصوّرات سب جل رہے ہیں۔

جوگندر پال کا ناول ''نادید'' اور انور سن رائے کا ناول ''چیخ'' بھی وجودیت کے بعض عناصر رکھتے ہیں۔ ان ناولوں میں بھی معاشرتی رویوں میں بے حسّی، بصارت و بصیرت دونوں سے عنقا لوگ جو صحیح صورت حال کو سمجھنا نہیں چاہتے۔ اور اگر سمجھ جائیں تو نکل نہیں پاتے۔ یہ سب اجزاء مل کر ان ناولوں کے تار و پود بنتے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ حنفی، شمیم، ص ۲۱
۲۔ نیّر، ناصر عباس، ص ۲۵
۳۔ ایضا، ص ۲۹
۴۔ جالبی، جمیل ڈاکٹر، ص ۳۱۵
۵۔ عسکری، حسن، ص ۸۰، ۸۱
۶۔ ناگی، انیس، ص ۸۷
۷۔ مفتی، شاہین ڈاکٹر، ص ۴۷
۸۔ احمد، ریاض، ص ۲۳۲
۹۔ قادر، سی۔اے ڈاکٹر، ص ۱۱۲
۱۰۔ اختر، وحید، ص ۲۶۷
۱۱۔ حیدر، قرۃ العین، ص ۲۷
۱۲۔ ایضاً
۱۳۔ اختر، وحید، ص ۲۶۷
۱۴۔ حیدر، قرۃ العین، ص ۵۶
۱۵۔ عثمان، فاروق، ص ۵۹۶
۱۶۔ مجتبیٰ اختر جمیل، ص ۲۵۹
۱۷۔ حسین، انتظار، ص ۱۵۱
۱۸۔ حسین، انتظار، ۱۹۸۴ء، ص ۸۸
۱۹۔ اشعر، مسعود، ص ۱۴۵
۲۰۔ حسین، خالدہ، ص ۷
۲۱۔ احمد، سہیل ڈاکٹر، ص ۱۱۱
۲۲۔ حسین، خالدہ، ص ۱۶۶
۲۳۔ ایضاً
۲۴۔ اشرف، خالد ڈاکٹر، ص ۲۷۰
۲۵۔ خاں، ممتاز احمد، ص ۱۰۱

۲۶۔ بٹ، نثار عزیز، ص ۱۷۴
۲۷۔ جاوید، قاضی، ص ۱۰۵، ۱۰۶
۲۸۔ ناگی، انیس، ص ۱۷
۲۹۔ صدیقی، محمد علی، ص ۴۹
۳۰۔ ناگی، انیس، ص ۲۷۷، ۲۷۸
۳۱۔ سجاد، انور، ص ۲۰
۳۲۔ جاوید، عقیلہ ڈاکٹر، ص ۲۳۸
۳۳۔ سجاد، انور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۵
۳۴۔ اعظمی، فہیم، ص ۱۱۴
۳۵۔ اعظمی، انجم، ص ۱۰
۳۶۔ اعظمی، فہیم، ص ۱۶۹
۳۷۔ خالد، فاروق، ص ۴۷
۳۸۔ ایضاً، ص ۱۰۱
۳۹۔ اشرف، اے۔ بی، ص ۱۸۱
۴۰۔ گل رحیم، ص ۱۷۹

فہرستِ اسنادِ محولہ

۱۔ احمد، ریاض، ۱۹۶۴ء، ''وجودیت کیا ہے''، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، شمارہ پنجم دوازدہم بہار، لاہور
۲۔ احمد، سہیل ڈاکٹر، ۲۰۰۵ء، ''طرفین''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
۳۔ اختر، وحید، ۱۹۹۲ء، ''آگ کا دریا اور وجودیت''، مشمولہ: قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ (مرتبہ) ارتضیٰ کریم، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی
۴۔ اشرف، اے بی، ڈاکٹر، ۱۹۸۷ء، ''جنت کی تلاش یا نئی نسل کا کرائسس''، مشمولہ: مجلّہ فنون، شمارہ ۶، ۷، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
۵۔ اشرف، خالد، ڈاکٹر، ۲۰۰۵ء، ''برصغیر میں اُردو ناول''، فکشن ہاؤس، لاہور
۶۔ اعظمی، فہیم، ۱۹۸۲ء، ''جنم کنڈلی''، الباقر یہ پبلی کیشنز، کراچی
۸۔ بٹ، نثار عزیز، ۱۹۸۰ء، ''کاروانِ وجود''، ایس۔ ٹی ہر مزار، راولپنڈی

۹۔ جالبی، جمیل ڈاکٹر، ۱۹۸۸ء ''تنقید اور تجربہ''، یونیورسل بکس، لاہور
۱۰۔ جاوید، عقیلہ ڈاکٹر، ۲۰۰۵ء ''اُردو ناول میں تانیثیت''، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
۱۱۔ حسین، انتظار، ۱۹۵۲ء ''چاند گہن''، مکتبہ کارواں، لاہور
۱۲۔ ـــــ، ۱۹۸۴ء ''آگے سمندر ہے''، سنگِ میل پبلی کیشنز
۱۳۔ حسین، خالدہ، ۲۰۰۵ء ''کاغذی گھاٹ''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
۱۴۔ حنفی، شمیم، ۲۰۰۵ء ''جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو حکومتِ ہند، نئی دہلی
۱۵۔ حیدر، قرۃ العین، ۱۹۸۵ء ''آگ کا دریا''، قوسین لاہور
۱۶۔ ـــــ، ۱۹۸۷ء ''گردشِ رنگ چمن''، مکتبہ دانیال کراچی
۱۷۔ سہیل عامر، ڈاکٹر، ۲۰۰۳ء، قرۃ العین حیدر ''خصوصی مطالعہ'' (مرتبہ)، بیکن بکس، ملتان
۱۸۔ خالد، فاروق، ۲۰۰۲ء ''سیاہ آئینے''، سارنگ پبلی کیشنز بارِ دوم، لاہور
۱۹۔ خاں، ممتاز احمد، ڈاکٹر، ۱۹۹۷ء ''آزادی کے بعد اُردو ناول، ہیئت، اسالیب، رجحانات'' (۱۹۴۷ء۔۱۹۸۷ء)، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی
۲۰۔ سجاد، انور، ۱۹۸۵ء ''خوشیوں کا باغ''، قوسین، لاہور
۲۱۔ ـــــ، ۱۹۹۶ء ''رگِ سنگ''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
۲۲۔ عسکری، حسن، ۱۹۷۹ء ''جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ''، عصمت میشن، راولپنڈی
۲۳۔ علی، نوازش ڈاکٹر، ۱۹۹۷ء، عبارت (اُردو ادب کے پچاس سال) مرتبہ، دھنگ پرنٹرز
۲۴۔ قادر، سی۔اے ڈاکٹر، ''وجودیت''، مشمولہ: فلسفہ جدید اور اُس کے دبستان، مغربی پاکستان، اُردو اکیڈمی، لاہور
۲۵۔ گل، رحیم، ۲۰۰۶ء ''جنت کی تلاش''، رابعہ بک ہاؤس اُردو بازار، لاہور
۲۶۔ مجتبیٰ، جمیل اختر، ڈاکٹر، ۲۰۰۲ء ''فلسفہ وجودیت اور جدید اُردو افسانہ''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
۲۷۔ مسعود، زاہد، ۱۹۹۷ء ''انیس ناگی ایک وجودی ناول نگار''، حسن پبلی کیشنز، لاہور
۲۸۔ مفتی، شاہین، ڈاکٹر، ۲۰۰۱ء ''جدید اُردو نظم میں وجودیت''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور
۲۹۔ ناگی، انیس، ۱۹۹۶ء ''میری ادبی بیاض''، جمالیات، لاہور
۳۰۔ ـــــ، ۱۹۸۹ء ''میں اور وہ''، فیروز سنز لاہور
۳۱۔ ـــــ، ۲۰۰۱ء، ۳۱۳ بریگیڈ ''جمالیات''، لاہور
۳۲۔ نیّر، ناصر عباس، ۲۰۰۴ء ''جدید اور مابعد جدید تنقید مغربی اور اُردو تناظر میں''، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی

Abstract

Modernism is a complex, multidimensional term that lends a few of its marked features to Existentialism. Existentialism is a philosophy that focuses on man's existence and views the universal perspectives with reference to subjective notions and internal states of mind. Modernism and Existentialism both have influenced the literature in the twentieth century world wide. Urdu novel has also absorbed the impact of this global trend and many of our renowned novelists; Quratulain Haider, Intizar Hussain, Khalida Hussain, Abdullah Hussain, Nisar Azeez But, Anees Nagi and Anwar Sajjad; have been influenced by these philosophies and have shown the arks in their novels. This article analyses and reviews the impact of these literary trends in Urdu Novel.